ضیاءالدین لاہوری

جنگِ آزادی کے پرستاروں پر تنقید کی مہم

جناب پیام شاہجہان پوری نے اپنے کالم (مطبوعہ ''دن'' 25,24 اگست 2002ء) میں جواب الجواب کے ساز وسامان کے ساتھ مسلح ہوکر ایک بار پھر جنگِ آزادی 1857ء کو فتنہ وفساد قرار دیا ہے۔ انہوں نے مجھ غریب کو احتساب کے کٹہرے میں کھڑا کر کے اوّل الزام یہ عائد کیا ہے کہ ان کے ایک کالم ''سرسید کا گناہ'' کے جواب میں' میرا جو مضمون شائع ہوا۔ اس میں متعدد کتابوں کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں'' مگر حرام ہے جو کسی ایک اقتباس کے نیچے حوالہ دیا ہو' وہ مجھ پر حسبِ توفیق خوب خوب برسے ہیں اور میرے اندازِ تحقیق کو سبحان اللہ کے زمرے میں ڈالتے ہوئے تان اس ضرب المثل پر توڑی ہے:

گر ہمیں مکتب وہمیں ملا کارِ طفلاں تمام خواہد شد

میں ان کے ادب پارے کی تصوراتی رفعت پر انہیں مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں مگر کیسے بتاؤں کہ میں اس معاملے میں بے اختیار تھا۔ موصوف ایک سینئر صحافی، نام ور کالم نگار اور اعلیٰ سطح کے مدیر کہلاتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اخبار یا جرائد اپنی پالیسی کے تحت مستقل قلم نگاروں کو گاہے بگاہے لکھنے والوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ موصوف کی صحافیانہ زندگی میں خود ان کے قلم سے مجھ جیسے کتنے گمنام قارئین کی تحریریں ادارتی کتر بیونت کی زد میں آئی ہوں گی۔ من کہ ملزم اپنی صفائی میں صرف یہی عرض کرسکتا ہے کہ اس نے تمام حوالے تحریر کئے تھے مگر مطبوعہ مضمون میں شائع نہ ہوئے۔ اسے خود اس کیفیت پر دکھ ہوا تھا۔ لہٰذا مجبوراً اس مضمون کی فوٹو سٹیٹ نقل اکوڑہ خٹک کے اس جریدے میں اشاعت کے لیے بھیجنا پڑی جس کا ذکر موصوف نے اپنے ایک حوالے میں کیا ہے۔ یہ تمام حوالے سند کے طور پر مضمون کے ساتھ جون 2002ء کے شمارے میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہاں ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔ کاش! موصوف مجھ پر الزام عائد کرنے سے پہلے اپنے صحافتی تجربے کو ذہن میں لاتے ہوئے ذاتی مراسم سے اس امر کی تصدیق کر لیتے کہ حوالے کہیں ادارتی معمولات کی نذر تو نہیں ہوگئے۔

موصوف راقم کے متعلق تحریر کرتے ہیں: ''مضمون نگار نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں نے انگریز کے خلاف بغاوت کو ناجائز'' ثابت کر کے'' آزادی کے لیے ملی تحریکات کو' جس میں تحریک پاکستان بھی شامل ہے۔ ناجائز قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ یہاں بھی موصوف نے حقیقتِ حال کے اظہار سے اغماض برتا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کو حرام یا ناجائز میں نے ثابت نہیں کیا ہے بلکہ یہ اُن علمائے دین نے ثابت کیا ہے' جن کے فتوے ہم نے اپنے مضمون میں پیش کئے ہیں۔''

یہاں موصوف نے لفظی ردّوبدل سے کام لیا ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ موصوف ''اپنی طرف سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں'' انہوں نے یوں تاثر دیا کہ میں نے اُن کی طرف سے بغاوت کا ناجائز ''ثابت کرنا'' تسلیم کرلیا ہے۔ ''ثابت کرنا چاہیے'' اور ''ثابت کرنے'' میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صورت اوّل میں صرف خواہش ہوتی ہے جبکہ صورت دوم میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ موصوف حقیقتاً کچھ ثابت نہیں کر سکے۔ محض فتوے پیش کئے ہیں اور فتویٰ کسی مسئلے پر مفتی یا عالم کے اپنے ذہن کے مطابق اس کے مسلک کی صرف ترجمانی ہوتی ہے۔ بعض مسئلوں پر تو ایک ہی مسلک کے علماء مختلف آراء کا اظہار کرتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہیں۔ لہٰذا اُن سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ اگر موصوف کے منتخب کردہ علماء کے فتووں سے انگریز آقا و مولیٰ ثابت ہو جاتے ہیں تو جن علماء نے انگریزوں کے خلاف فتوے دیئے انہیں ثبوت کیوں نہیں مانا جاتا؟ موجودہ بحث سے اگر کوئی بات ثابت ہوتی ہے تو صرف یہ کہ فتوے انگریزوں کے حق میں دیئے گئے تھے اور اُن کے خلاف بھی۔ تحریک پاکستان کے حوالے سے جب موصوف کہتے ہیں کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کو حرام یا ناجائز انہوں نے نہیں بلکہ علمائے دین نے ثابت کیا ہے تو عرض ہے کہ اُن کا ایسے فتوے بار بار پیش کرنا چہ معنی دارد؟ موصوف انہیں تسلیم کرتے ہیں۔ ان پر اصرار کرتے ہیں۔ انہیں ثبوت بھی کہتے ہیں اور آگے پیش کر دیتے ہیں تو بلاشک وشبہ یہ بات ان کی بھی ہوگئی کہ آزادی کے لیے ملی تحریکات جس میں تحریک پاکستان بھی شامل ہے' حرام تھیں اور 1857ء کی جنگِ آزادی کو تو موصوف خود اپنے الفاظ میں صاف صاف 1857ء کے تلنگوں کی وحشیانہ بغاوت'' قرار دے ہی چکے ہیں۔

اس کے بعد موصوف راقم کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''آپ کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ہم نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے مختلف حالات کے پس منظر میں تحریر کئے ہوئے فتوؤں کے نتائج کو زبردستی پیچھے لے جا کر 1857ء پر منطبق کر دیا ہے۔'' میرا یہ کہنا غلط ہے یا صحیح' پہلے اپنی تحریر پر غور فرمائیں۔

موصوف نے لکھا تھا: ''سرسید احمد خان زیرک انسان تھے۔ علوم دینیہ سے واقف بھی تھے۔ بلاشبہ انہوں نے 1857ء کے ہنگامے کو جہاد قرار نہیں دیا بلکہ فساد قرار دیا مگر کیا اس فکر اور سوچ میں وہ تنہا تھے؟ ''اس دور'' کا کونسا مسلمان فرقہ ایسا تھا جس کے اکابر علماء نے انگریز کے خلاف ''اس بغاوت'' کی مذمت نہ کی ہو' بلکہ ان اکابر علماء نے تو ''اس بغاوت'' میں شرکت کو حرام قرار دیا چنانچہ.....'' اس کے بعد انہوں نے اپنی بات ثابت کرنے لیے مختلف مسالک کے علماء کے فتوؤں کی عبارتیں پیش کی ہیں۔

موصوف کی اس عبارت پر غور فرمایئے! اس میں 1857ء کے حوالے سے یہ تاثر دیا گیا ہے کہ ''اس دور'' کے تمام فرقوں کے اکابر علماء نے انگریز کے خلاف ''اس بغاوت'' (یعنی 1857ء کی جنگِ آزادی) کی مذمت کی جبکہ ان کی اس عبارت والے مضمون میں ان کے نقل کردہ فتووں کی تمام عبارتیں متذکرہ بغاوت کے ذکر سے قطعاً خالی ہیں۔ یہ تمام عبارتیں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی تحریر کردہ ہیں اور انہی ادوار سے متعلق ہیں۔ میں اپنے دعوے

پر اب بھی قائم ہوں۔فتووں کے جو اقتباسات موصوف نے درج کئے تھے'ان میں کہیں بھی ''اس بغاوت''یعنی 1857ء کی جنگِ آزادی کی مذمت میں کوئی فقرہ ہے تو اس کی نشاندہی فرمایئے۔غیر متعلق عبارتوں کے اقتباسات کے ساتھ ان کی حوالہ جاتی کتب سے اپنے مضمون کو مزین کر دینا ایک سراب ہے۔اس سے متعلقہ بات پایۂ ثبوب کو نہیں پہنچ سکتی۔مزید برآں اگر کوئی شخص کسی سوچ اور فکر میں تنہا نہیں بلکہ بعض دوسرے بھی اس کے ساتھ شریک ہوں تو یہ امر اس ٹولے کی فکر کے سچا ہونے کی دلیل نہیں بن جاتی۔

موصوف نے اپنے موجودہ مضمون میں ایسے تاریخی قصوں کے اقتباسات درج کئے ہیں جن میں بعض معروف علماء کو انگریزوں کی حمایت میں حریت پسندوں سے نبرد آزما بتایا گیا ہے۔ان کے بارے میں عرض ہے کہ ایسے ہنگامی حالات کے دوران اور ان کے بعد بہت سے فرضی قصے کہانیاں جنم لیتی ہیں۔تحقیقی امور میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ایسے واقعات کے بارے میں دستاویزی ثبوت کے بغیر کسی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ذاتی تجربات کے ضمن میں بیان کردہ واقعات البتہ قابل ترجیح ہوتے ہیں بشرطیکہ بیان کنندہ معروف اور قابل اعتماد ہو۔بعض واقعہ نگار مخصوص مقاصد کے تحت کہانیاں گھڑتے ہیں جنہیں بعد میں وسعت دینے کا ''فریضہ''ان کے مسلک دار انجام دیتے ہیں۔تاریخ میں من گھڑت قصے بنانے والوں کا ذکر آتا ہے مگر محقق اور تاریخ نویس ان کی بیان کردہ ایسی کہانیوں کو تسلیم نہیں کرتے۔

موصوف یہ سوال کرتے ہیں کہ بہت سے علماء جو غدر کے مخالف تھے' کیا غدارِ قوم اور اسلام دشمن تھے؟ میں یہ پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ وہ ڈھیروں علماء' جو انگریز مخالف رویہ رکھتے تھے' کیا غدارِ قوم اور اسلام دشمن تھے؟ موصوف نے تو کسی کے اس قول پر کہ ''غدر میں بہت سے علماء مخالف تھے کہ یہ جہاد نہیں'' آناً فاناً یہ فیصلہ سنا دیا کہ ''بہت سے علماء کثرتِ تعداد پر دلالت کرتے ہیں۔'' پھر انہوں نے چیدہ چیدہ علماء کے فتووں کے ذکر کے ساتھ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کو ''ہمارے عہد کا فاضل مورخ اور اسکالر'' قرار دیتے ہوئے ان کی کتاب ''جنگِ آزادی 1857ء'' کے حوالے سے 1857ء سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے معروف صاحب علم ملازمین کے ناموں کی ایک فہرست پیش کی ہے۔جنہوں نے ''بقول مؤلف سرکار کمپنی کا اقتدار مستحکم کیا۔'' ''بقول مؤلف'' کے پردے میں یہ فہرست نقل کرنا بالکل بے مقصد ہے کیونکہ اوّل تو یہ زیر بحث دور 1857ء سے پہلے کی بات ہے جبکہ اصل مسئلہ پروان ہی نہ چڑھا تھا۔دوسری بات یہ کہ ملازمت اور سیاسی وفاداری وخیر خواہی میں بہت فرق ہے۔لطف کی بات یہ ہے کہ اس فہرست کو نقل کرتے ہوئے موصوف نے اصل حوالے میں درج ناموں کے ساتھ افراد کے سنینِ وفات حذف کر دیئے جن سے معلوم ہو سکتا تھا کہ اس فہرست میں بعض ایسے اصحاب کا اندراج بھی ہے جو جنگِ آزادی سے تیس چالیس سال قبل انتقال کر چکے تھے۔اس طرح موصوف نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ انگریزوں کے وفادار علماء کی ننھی منی تعداد میں سترہ کمپنی کے صاحبِ علم ملازمین کا بطور علماء اضافہ تو کر لیا مگر انہوں نے اسی ''فاضل مؤرخ اور اسکالر'' کی اسی ضخیم کتاب سے ان بے شمار معروف علماء کی فہرست ترتیب دینے کی زحمت گوارا نہ کی

۔جنہوں نے انگریزوں کے خلاف قلمی اور عملی جدوجہد کی ۔موصوف نے مولوی عاشق علی میرٹھی کی کتاب ''تذکرۃ الرشید'' کے حوالے سے بتایا ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی، حاجی امداداللہ مکی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سرکار برطانیہ کے جاں نثار تھے جبکہ ''ہمارے عہد کا فاضل مؤرخ اور اسکالر'' اپنی اسی کتاب میں حاجی امداد اللہ مکی کو ''امیر جہاد'' اور مولانا رشید احمد گنگوہی کو اس حربی جماعت کے عہدہ ''فصل قضایا'' پر مامور بتا رہا ہے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نام مجلس شوریٰ کی فہرست میں درج کیا ہے (صفحہ 178) کس کی بات درست مانی جائے؟ موصوف تو اپنے مسلک کی حمایت میں صورت اوّل کو ترجیح دیں گے کیونکہ دوسری صورت پر کڑوا کڑوا تھوتھو کی ضرب المثل صادق آتی ہے جبکہ تحقیقی نقطۂ نظر سے دونوں دعوے تشنۂ تحقیق ہیں کیونکہ دونوں مصنفین نے اپنی ان تحریروں کے ذیل میں کوئی حوالے درج نہیں کئے۔

موصوف نے سرسید کو نظریہ پاکستان کا بانی اور سب سے پہلے دوقومی نظریئے کی تھیوری پیش کرنے والا قرار دیا ہے۔ میں اس دعوے کو برصغیر کی تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ قرار دیتا ہوں۔ سرسید نہ تو نظریہ پاکستان کے بانی تھے اور نہ ہی دوقومی نظریئے کے خالق۔ ہمارے ہاں یہ بات ایک خاص طبقے نے مخصوص مصلحتوں کے تحت پھیلائی ہے جسے ہمارے تعلیمی نصاب اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے تقویت پہنچائی جارہی ہے۔ نظریۂ قوم کے موضوع پر سرسید کے متعدد اقوال میں سے صرف چار مختصر اقتباسات پیش خدمت ہیں:

1: تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں اور میں قوم کی خصوصیت کے واسطے مذہب اور فرقہ اور گروہ پسند نہیں کرتا۔

(مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز صفحہ 137)

2: وہ زمانہ اب نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھے جائیں۔

(سفرنامہ پنجاب۔ مطبوعہ 1884ء صفحہ 143)

3: لفظ ''قوم'' سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہ وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ ''نیشن'' (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے؟ (ایضاً صفحہ 167)

4: یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی' جو اسی ملک میں رہتے ہیں' اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ (ایضاً صفحہ 94)

واضح ہو کہ اقتباس اوّل 1873ء اور باقی اقتباسات 1884ء کی تقریروں سے لیے گئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں موصوف کے مضمون اوّل میں درج بنارس کا 1867ء کا حوالہ کوئی وقعت نہیں رکھتا کیونکہ کسی شخصیت کے آخری دور کے خیالات ہی اس کے اصلی افکار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ قائداعظم بھی تو پہلے ہندو اور مسلمانوں میں ''اتحاد کے سفیر'' کہلاتے تھے مگر بعد میں انہوں نے دوقومی نظریہ اپنایا تو یہی ان کی شخصیت کے ساتھ منسوب ہوا۔

موصوف قائداعظم اور ان کے چند ساتھیوں کا نام لے کر ان کی جدوجہد کے حوالے سے سوال کرتے ہیں کہ کیا

انہوں نے ''کبھی سول نافرمانی کی؟ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا؟ پولیس کی لاٹھیاں کھائیں؟ کبھی جیل گئے؟''

سبحان اللہ! کیا ہی ہاتھ کی صفائی ہے! کیا آزادی کی تحریک میں پولیس کی لاٹھیاں کھانے، جیل جانے والے ضروری طور پر فسادی اور دہشت گرد ہوتے ہیں؟ قائدِ اعظم کی جماعت کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ سطح تک کے سینکڑوں عہدیداروں نے جیل یاترا کی۔ اس کے علاوہ ہزاروں کارکن قیدی بنے اور لاٹھیاں کھائیں۔ آزادی کے پرستاروں کو کس ڈھٹائی کے ساتھ فسادیوں کے کھاتے میں ڈالا جارہا ہے اور ان کی قربانیوں کو وحشت اور دہشت سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ کسی تحریک میں شامل تمام ارکان کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ جیل جائیں یا لاٹھیاں کھائیں۔ تحریک میں ان کے رویوں کو دیکھا جاتا ہے۔ موصوف کے نامزد چند قائدین کو اگر یہ موقع میسر نہیں آسکا یا انہوں نے کسی حکمتِ عملی کے تحت ان سے گریز کیا کوئی مثال کوئی ضابطہ نہیں بن جاتی۔ جنگوں میں کمانڈر انچیف کا کام حربی منصوبہ بندی اور ہراول دستوں کو باعمل رکھنا ہوتا ہے جبکہ عام فوجی اپنے متعین کردہ فرائض کے مطابق لڑتے ہیں۔ تحریکوں میں بھی قائدین اور کارکن وقت کی مصلحتوں کے مطابق حکمت عملیاں اپناتے ہیں۔ ہمیں آزادی پر امن اور قانونی جہدوجہد کے نتیجے میں نہیں بلکہ ہزارہا جانبازوں کی قربانیوں کے صلے میں ملی۔ اس کی بنیاد 1857ء کی جنگِ آزادی میں رکھ دی گئی تھی۔ اگرچہ یہ جنگ کسی پیش بندی کے بغیر اچانک شروع ہوئی اور اس وجہ سے نظم وضبط، باہمی روابط، منصوبہ بندی اور مرکزیت کے فقدان کے علاوہ سرمائے کی عدم دستیابی اور آستین کے سانپوں کے مخبری کارناموں کے باعث وقتی طور پر ناکام ہوگئی مگر اپنی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود مستقبل کے لیے جدوجہد کا موزوں راستہ متعین کرنے کی ایک راہِ عمل چھوڑ گئی۔ اسے فساد یا دہشت گردی کہنے والوں کی اپنی ذہنی سطح اور ان کا اپنا معیار ہے۔ اس کے بعد نوے برس کے عرصے کے دوران میں بھی وقتاً فوقتاً حربی معرکے جاری رہے اور یہی باعث ہے کہ انگریزوں کو توپوں، گولیوں، پھانسی کے پھندوں اور کالے پانی کی سزاؤں کے بعد بتدریج قید خانے بھرنے اور لاٹھیوں کے استعمال کی سطح تک اترنا پڑا۔ بعد میں وہ اگر گفت وشنید پر آمادہ ہوئے تو حریت پسندوں کی عملی جدوجہد ہی کی بنا پر اگرچہ اس عمل میں بھی وہ ایک طویل عرصہ گزار گئے۔ اگر انہیں مستقل امن وسکون کا ماحول ملتا تو وہ کبھی جانے والے نہ تھے۔ وہ آرام سے سونے کی چڑیا کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔ اس لیے یہ جنگ کبھی نہ کبھی تو ہونا ہی تھی۔ اگر جنگِ آزادی 1857ء میں نہ ہوئی ہوتی تو ہم 1947ء میں آزاد نہ ہوسکتے۔ اس جنگ میں تاخیر ہوتی تو آزادی بھی پیچھے جاپڑتی۔ جو لوگ انگریزوں کے باجماعت حاشیہ بردار رہے اور اہل وطن کی جاسوسی کے کارنامے انجام دے کر سرکاری انعام واکرام وصول کرتے رہے۔ انہیں مفت میں آزادی مل گئی۔ انعام واکرام کے وہ مواقع نہ رہے تو ان کے دانشور اپنے قلم کے جوہر دکھا کر حریت پسندوں کے خلاف قوم کے افراد کے ذہنوں میں کھلے بندوں شکوک پیدا کرنے لگے اور بالآخر انہیں فسادی قرار دیتے ہوئے ان پر تبرا بھیجنے کی مہم شروع کردی۔ ان میں ایک بات البتہ ضرور ہے کہ وہ لوگ احسان فراموش نہیں کیونکہ ایسا کرکے وہ سابق آقاؤں کا حقِ نمک ادا کررہے ہیں۔